اقبال بحیثیت قومی شاعر

شرف الدین اصلاحی

ایک اعتبار سے ہم اردو کے شاعروں کو دو گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔ ایک قسم ان شاعروں کی ہے جنھوں نے محض شاعری کی ہے ۔ ان شاعروں کے سامنے کوئی مقصد نہ تھا ۔ ان کی شاعری حسن و عشق کے مضامین تک محدود ہے ۔ وہ اپنی شاعری میں زیادہ تر باتوں کی طوطا مینا بناتے ہیں ۔ ان کی شاعری صناعی اور بسا اوقات صنعت گری معلوم ہوتی ہے ۔ دوسری قسم میں وہ شعراء آتے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری سے قوم کی اصلاح کا کام لیا اور اپنی شاعری کے ذریعے سوئی ہوئی قوم کو جگانے کی کوشش کی ہے ۔ ایسے ہی شاعروں کو ہم قومی شاعر اور ان کی شاعری کو قومی شاعری کہتے ہیں ۔

آج سے دو سو سال پہلے اگر کوئی یہ کہتا کہ فلاں شخص قومی شاعر ہے تو شاید بات کسی کی سمجھ میں نہ آتی ۔ اس لئے کہ اس وقت شعر و شاعری کا مفہوم آج کے مفہوم سے بہت مختلف تھا ۔ شاعری خیالی دنیا کی بات تصور کی جاتی تھی ۔ شاعر اپنی اور اپنے محبوب کی باتیں کرکے اپنا اور دوسروں کا دل بہلاتا ۔ اسے اس سے غرض نہ تھی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے ۔ اس کی دنیا اس کی ذات تک محدود تھی اور وہ اپنی دنیا میں مست و مگن تھا ۔ قوم اور قومیت کے لفظ سے نہ عام لوگ واقف تھے نہ شاعر ۔ پھر قومی شاعری کیوں کر وجود میں آتی اور قومی شاعر کہاں سے پیدا ہوتے ۔ ۱۸۵۷ع کے انقلاب کے بعد جب حالات بدلے تو خیالات میں بھی تبدیلی آئی ۔ غیروں کی غلامی نے دلوں میں قومیت کا احساس بیدار کیا ۔ شاعر قوم کا سب سے حساس طبقہ ہوتا

ہے۔ اس لئے اس کے دل میں قومی ھمدردی کے جذبات کا پیدا ھونا لازمی تھا۔

اقبال کی بہت سی حیثیتیں ھیں۔ مثلاً اقبال بحیثیت فلسفی اور مفکر، اقبال بحیثیت پیغام بر حیات، اقبال بحیثیت مدبر، اقبال بحیثیت مصلح اور ریفارمر، اور ان سب کے بعد اقبال بحیثیت شاعر پھر شاعر ھونے کی حیثیت سے اقبال کی شاعری کے کئی پہلو ھیں۔ ایک تو اقبال کی شاعری کا وہ رنگ ہے جس میں وہ خالصۃً شاعر نظر آتے ھیں۔ اس رنگ میں ان کے شاعرانہ تخیل کی پرواز اور تغزل کا آھنگ نمایاں ہے۔ اس رنگ کی جھلک ان اشعار میں دیکھئے:

نہ آتے ھمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ھوئے عار کیا تھی

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی

اقبال کی شاعری کا یہ رنگ خالص شاعرانہ ہے، اس میں نہ فکر ہے، نہ فلسفہ ہے، نہ پیغام ہے، نہ اصلاح کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے۔

اس کے سوا ان کی شاعری کا ایک دوسرا رنگ وہ ہے جس میں فن پر مقصدیت غالب نظر آتی ہے۔ یہاں شاعری مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالذات کچھ اور ہے۔ شاعر کچھ کہنا چاھتا ہے۔ اور اس کے لئے اس نے شعر و شاعری کو بطور ذریعہ استعمال کیا ہے۔ اقبال کی شاعری کا یہی حصہ ہے جس کو ھم اقبال کی مقصدی یا قومی شاعری سے تعبیر کر سکتے ھیں۔ اقبال کی بے مقصد شاعری کا دور بہت ھی مختصر تھا اور ان کے کلام کا تھوڑا ھی حصہ اس کے ذیل میں آ سکتا ہے۔

۱۸۰۷ء کے بعد سے برصغیر کے مسلمانوں کی قومی زندگی میں جہاں اور بہت سی نئی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں وہاں یہ بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ ان کے شاعروں میں بھی تبدیلی آئی۔ شعر و شاعری کی دنیا میں جو تبدیلیاں آئیں ان میں سے ایک اہم تبدیلی یہ تھی کہ شاعر جو ابھی تک اپنی ایک الگ تھلگ دنیا بسائے اپنی ذات میں گم رہتا تھا ملک اور قوم کی تباہ حالت دیکھ کر اس کی ہمدردی اور غمخواری میں آنسو بہانے لگا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مسدس لکھ کر گویا امت مسلمہ کا مرثیہ لکھا اور اس کے بعد ساری زندگی اسی کے غم میں رویا کئے۔

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

اکبر الہ آبادی نے بھی اپنے خاص انداز میں یہی فریضہ انجام دیا۔

مسلمانو! بتاؤ تو تمھیں اپنی خبر کچھ ہے
تمہارے کیا مدارج رہ گئے ان پر نظر کچھ ہے

ان دونوں بزرگوں نے قوم کو اس کا شاندار ماضی یاد دلایا۔ اور حال کی ذلت و پستی کا احساس دلا کر اصلاح و ترقی کا پیغام دیا۔ قومی شاعر کی حیثیت سے حالی اور اکبر نے ملک و ملت کی جو خدمت انجام دی وہ بہت بڑی ہے۔ اور ان کی بڑائی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ دونوں اقبال کے پیش رو ہیں اور خود اقبال نے ان کی خدمات کا اعتراف کرکے انھیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مگر اقبال نے قومی شاعر کی حیثیت سے جو کام کیا وہ کسی اور سے نہ بن سکا۔ اقبال کے سامنے ایک مشن تھا اور اس مشن کو انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ پورا کیا۔

اقبال یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ انھوں نے اسلام کا سیدھا راستہ چھوڑ دیا ہے۔

اور اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسلمان دوبارہ اسلام سے اپنے رشتے کو استوار کرلیں۔ مسلمانوں میں جتنی خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں وہ سب اسلام سے دوری کا نتیجہ تھیں اور ان خرابیوں کی اصلاح اگر ہوسکتی تھی تو صرف اسی صورت میں کہ مسلمان اسلام کی تعلیمات پر عمل کریں۔ اس کے لئے اقبال نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے کلام کے ذریعہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا کیا کہ ان کی حالت خراب ہے اور اس خراب حالت سے نکلنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دین پر عمل کیا جائے۔

اقبال نے دوسرا کام یہ کیا کہ اسلام کی تعلیمات کو اپنے اشعار میں اس طرح سمو دیا کہ لوگ شوق سے ان کو پڑھیں اور اثر قبول کریں۔ اور تیسرا کام جو سب سے اہم اور ضروری تھا اقبال نے یہ کیا کہ مغربی تہذیب کے اثر سے مسلمانوں میں آئے دن جو نئے نئے فتنے پیدا ہورہے تھے ان کی روک تھام کی۔ مغرب کے اثر سے مسلمانوں میں جو فتنے اٹھے ان میں سے ایک تصور قومیت (بمعنی خاص) بھی ہے۔ مسلم قومیت (بمعنی ملت) کی بنیاد رنگ نسل اور وطن پر نہیں تھی بلکہ دین پر تھی۔ لیکن مسلمانوں میں جب دینی رشتہ کمزور ہوگیا تو وہ گمراہ کن خیالات کا شکار ہونے لگے۔ اور اس طرح امت مسلمہ کی جمعیت پریشان ہوگئی اور مسلمان گروہوں اور ٹکڑوں میں بٹ گئے۔ مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ ان کی آپس کی پھوٹ اور نا اتفاقی تھی۔ ذات ، برادری، رنگ، نسل اور وطن کی وجہ سے مسلمانوں میں جو اختلافات پیدا ہو رہے تھے اقبال نے ان پر ضرب کاری لگائی اور ان باتوں کو اجاگر کیا جو ان میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے والی تھیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک

حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں
(جواب شکوہ)

فرقہ بندی جو مذہب کے راستے آتی ہے وہ بھی ملت کے حصار میں رخنہ ڈالنے والی ہے۔ اس لئے اقبال خبردار کرتے ہیں :

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں
ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں
(سید زادے کے نام)

اسلام کا رشتہ ہی اصل میں مسلمانوں کو جوڑنے والا تھا۔ جب یہ رشتہ کمزور پڑگیا تو ملت اور اسلامی قومیت کا تصور نگاہوں سے اوجھل ہوگیا اور اس کی جگہ فرقہ وارانہ تقسیم اور گروہ بندیوں نے لے لی۔ اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اول و آخر مسلمان ہونا چاہئے، باقی سب باتیں فضول ہیں :

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ کہ مسلمان بھی ہو

ایک صحابی کا واقعہ ہے کسی نے ان سے ان کی ولدیت دریافت کی۔ جواب میں انھوں نے کہا میرا باپ اسلام ہے اس کے سوا میرا کوئی باپ نہیں۔ یہی جذبہ تھا جس نے اسلام کے ابتدائی دور میں "میں اور تم" کے فرق کو مٹا کر پوری امت کو سیسے کی دیوار بنادیا تھا۔ اور بعد میں جب یہ جذبہ کمزور پڑ گیا اور اس کی جگہ دوسرے جذبات نے لے لی تو وہی امت دشمنوں کے مقابلے میں ریت کی دیوار ثابت ہوئی۔ اقبال کی نظر میں مسلمان کے زوال کی بڑی

جه یہی ہے کہ قوم کے افراد میں ملی وحدت کا احساس کمزور پڑگیا ہے۔
سی لئے زور دیکر وہ کہتے ہیں :

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

موج دریا سے الگ ہوکر اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے اور فنا ہوجاتی ہے۔
اسی طرح فرد اگر قوم سے اپنا ناتا توڑ لے تو اس کی زندگی بے معنی ہوجاتی ہے۔
اقبال نے اپنی ایک نظم کا عنوان قائم کیا ہے ''پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ،،۔ اس نظم کا آخری شعر ہے :

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

اس نظم میں اقبال نے فرد کے لئے شاخ اور ملت کے لئے درخت کا استعارہ کیا ہے۔ شاخ اگر اپنی اصل سے جدا کردی جائے تو وہ ہری بھری تو کیا زندہ بھی نہیں رہ سکتی، اوپر سے چاہے اس کی زندگی کا کتنا ہی سامان کیا جائے۔ اس کو پانی بھی دیا جائے کھاد بھی دی جائے اور دوسرے وسائل حیات اس کو زندگی دینے کی تمام کوشش کریں مگر وہ سوکھ کر لکڑی ہو جائے گی اور اس کا مصرف اس کے سوا کچھ نہ رہے گا کہ اس کو جلا دیا جائے۔

اقبال فرد کے مقابلے میں جماعت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور یہی اسلام کی تعلیم ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے۔ ید اللہ علی الجماعة۔ جماعت کے سر پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔

فرد یا ذات اور فرقے کی طرح وہ علاقائی حد بندیوں کو بھی ملت کے لئے تباہ کن تصور کرتے ہیں۔ وہ تلقین فرماتے ہیں :

بتان رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی
(طلوع اسلام)

ایک توحید پرست مسلمان جس کا عقیدہ ہو کہ تمام انسان ایک خدا کی مخلوق ہیں، یہ زمین خدا کی ہے، مسلمان خدا کا بندہ ہے اس لئے اس زمین کے ہر حصے پر اس کا برابر کا حق ہے، وہ اپنے آپ کو کسی ایک جگہ میں محدود کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں :

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند

علامہ اقبال ایک کافر اور مومن کا فرق یہ بتاتے ہیں کہ کافر دنیا کی جغرافیائی حد بندیوں کا غلام ہے جبکہ مومن ساری دنیا کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے :

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

وطنیت کا مغربی تصور مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا فتنہ تھا۔ مسلمان خدا پرست ہوتا ہے وہ وطن پرست نہیں ہوسکتا۔ لیکن مغرب نے وطن پرستی کی لعنت دنیا میں پھیلائی تو مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے۔ اقبال یہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمان وطنیت کی لعنت میں گرفتار ہوگئے تو اسلام نے ملت کا جو تصور مسلمانوں کو دیا ہے وہ ختم ہوجائے گا۔ مسلمان وطن کی بنیاد پر مختلف قوموں میں بٹ جائیں گے اور اس طرح ان کی قوت کمزور ہو جائے گی اور اس کے بعد دشمن آسانی سے ان کو ختم کردیں گے۔ چنانچہ انھوں نے بڑی سختی کے ساتھ مغرب کے پھیلائے ہوئے غلط اثرات کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ان کی ایک مشہور نظم ہے جس کا عنوان ہی وطنیت (یعنی وطن بحیثیت

ایک سیاسی تصور کے) ہے۔ اس نظم میں انھوں نے وطن پرستی کے باطل خیالات کو شد و مد کے ساتھ رد کیا ہے - اور مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ وہ اس فتنہ سے خبر دار رہیں۔

اس نظم کے جستہ جستہ اشعار ملاحظہ ہوں :

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
وہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی

ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبال وطن پرستی کے خلاف ہیں - انھوں نے وطن کے سیاسی تصور کے خلاف آواز اٹھائی ہے جو ملت اسلامیہ کو تباہ کرنے والا ہے - ورنہ وطن کی محبت کے فطری جذبے کو وہ برا نہیں کہتے- اپنے وطن سے ہر انسان کو لگاؤ ہوتا ہے - برصغیر اقبال کا وطن تھا - انھوں نے جابجا اس کی محبت کے گن گائے ہیں - اس کی جھلکیاں ان کی ابتدائی شاعری میں بکثرت نظرآتی ہیں - بلکہ کہیں کہیں ان کا جذبۂ حب الوطن حد سے گذرتا دکھائی دیتا ہے -

جب پہلے پہلے اقبال کی زبان پر قوم کا لفظ آتا ہے تو قوم سے ان کی مراد ہندوستانی قوم ہوتی ہے جس میں ہندو مسلم سکھ عیسائی سبھی شریک ہیں۔ ان کا وطن چونکہ ہندوستان ہے اس لئے وہ ہندوستان اور اہل ہندوستان کی محبت کے گیت گاتے ہیں ۔ اقبال کا وطن ایک ایسا ملک تھا جہاں مختلف مذاہب رکھنے والی قومیں آباد تھیں۔ ان میں ذات پات کے امتیازات بھی کارفرما تھے ۔ مختلف علاقوں کی زبانیں مختلف تھیں جن کی وجہ سے وہ آپس میں دست و گریباں رہتے تھے۔ یہ غلامی کا دور تھا ایک اجنبی قوم ہندوستان کی حاکم کل بنی ہوئی تھی۔ انگریز ہندوستان میں اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ہندوستانی باشندوں کے باہمی افتراق کو ضروری سمجھتے تھے ۔ اور ایسے فتنوں کو ہوا دیتے تھے جن سے آپس میں اتحاد قائم نہ ہوسکے، بلکہ پھوٹ اور نفاق بڑھے ۔ اقبال اس صورت حال کو دیکھ کر کڑھتے ہیں ۔ وہ ایک طرف ہندوستان کے تمام باشندوں کو ایک تسبیح کے دانے کہہ کر اتحاد و اتفاق اور میل‌جول سے رہنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ دوسری طرف اشارہ و کنایہ میں اجنبی اقتدار کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرتے ہیں ۔

اقبال کی شاعری کے اس دور میں وطن کی محبت، ہندو مسلم اتحاد اور غلامی کے خلاف نفرت کے جذبات کا اظہار زیادہ ملتا ہے ۔

بانگ درا کے ابتدائی صفحات میں ایسی متعدد نظمیں ہیں جو شاعر کے جذبہ حب‌الوطن کی آئینہ دار ہیں ۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کی نظر حدود وطن سے بہت کم باہر جاتی ہے ۔ ''تصویر درد،، کے ان اشعار میں وہ ایک محب وطن شاعر کی حیثیت سے جلوہ گر ہیں :

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

تجھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

ایک دوسری نظم ہے ''صدائے درد،، اس کے چند اشعار دیکھئے :

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے

سر زمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

ظاہر ہے کہ اس جگہ سر زمین سے مراد ہندوستان ہے۔ شاعر سرزمین ہند کے تمام باسیوں کو ایک قوم تصور کرتا ہے اور ان کے درد میں آنسو بہاتا ہے۔ اور کہیں کہیں تو شاعر کا جذبہ حب‌الوطن وطن پرستی کی حد میں داخل ہوجاتا ہے۔ وہ وطن کو تقدس کی نظر سے دیکھتا ہے مثلاً اس دور کی شاعری میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں :

کوہ ہمالہ سے خطاب ہے :

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

اپنی شاعری کے اس دور میں اقبال ''ترانہ ہندی،، لکھ کر اپنے وطن ہندوستان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں :

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

(ظاہر ہے اس سارے جہاں میں سرزمین حجاز، مکہ اور مدینہ بھی شامل ہے

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اسی زمانہ میں وہ ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت،، لکھتے ہیں اس میں رواداری اور وسیع المشربی کی لے کتنی بلند ہے۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے
ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یہی نہیں اقبال کے اس دور کے کلام میں ''نیا شوالہ،، جیسی نظمیں بھی ملتی ہیں :

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے

شاعر دیر کے ساتھ حرم سے بھی کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔ وطن کی خاک کا ذرہ ذرہ اس کی نظر میں دیوتا کا مقام رکھتا ہے۔ اس دور میں اقبال کے صرف ذخیرہ الفاظ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے دل و دماغ پر ہندوستانی قومیت کس طرح چھائی ہوئی ہے۔ اس ایک چھوٹی سی نظم (نیا شوالہ) میں اتنے الفاظ ہیں جو خالص ہندیت اور ہندوئیت کے غماز ہیں۔ برھمن، بت، بیر، دیر، مورتی، دیوتا، شوالہ، دیس، تیرتھ، منتر، پجاری، پیت ی، شانتی، بھگت، دھرتی، باسی، مکتی، پریت۔

جیسا کہ صراحت کی جاچکی ہے یہ اقبال کے ابتدائی دور کا کلام ہے، نہ ہنوز اقبال عمر، علم اور تجربہ کے لحاظ سے اس مقام پر نہیں پہنچے تھے ، پر کہ وہ بعد میں فائز ہوئے۔ اسے ہم ان کی شاعری کا عہد طفولیت ہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں انھوں نے شعر کہے اور خوب کہے مگر صاف لوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ان کا شعور ابھی بلوغ کی اس زل میں داخل نہیں ہوا ہے جس نے اقبال کو علامہ اقبال، شاعر مشرق کیم الامت اور مفکر اسلام جیسے خطابات کا سزاوار ٹھیرایا۔ ہم قومی شاعر ی حیثیت سے اقبال کے افکار و خیالات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ گزشتہ سطور میں قبال کی قومی شاعری کے ضمن میں جو کچھ کہا گیا اس سے یہ تو ضرور واضح ہوتا ہے کہ اقبال کے اندر قومی شعور بیدار ہوچکا ہے مگر یہ بھی صاف نظر آتا ہے کہ ان کا تصور قومیت محدود ہے۔ تاریخی ترتیب سے کلام اقبال کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت روشن ہوکر سامنے آجاتی ہے کہ یہ اقبال کے ذہنی سفر کی پہلی منزل ہے۔ ان اشعار کی روشنی میں اقبال ہندوستان کے قومی شاعر تو نظر آتے ہیں مگر ہم انہیں مسلمانوں کا قومی شاعر نہیں کہہ سکتے۔

جن لوگوں نے کلام اقبال کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ
اس کا کچھ ہی حصہ ایسا ہے جس میں وہ وطنی قومیت کے زیر اثر معلوم
ہوتے ہیں ۔ اس حصہ کو چھوڑ کر ان کا باقی کلام تمام کا تمام ایسا ہے کہ
اس میں قوم سے اقبال کی مراد مسلمان ہیں ۔ وطنی اور ملکی قومیت کے گھروندے
سے اقبال بہت جلد نکل آئے ۔ اور وہ مسلم قومیت کا پرچار کرنے لگے ۔ وہ
اقبال جس نے اس سے پہلے ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، ہمالہ
نیا شوالہ جیسی نظمیں لکھی تھیں وہ ترانہ ملی لکھ کر اپنے اسلامی شعور
کا احساس دلاتا ہے ۔ ترانہ ہندی کے بعض اشعار اوپر گزر چکے ہیں ان اشعار
کے بالمقابل ترانہ ملی کے ان اشعار کو ملاحظہ فرمائیے :

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

بانگ درا کی کچھ نظموں کو چھوڑ کر اقبال کی شاعری کا دفتر کا دفتر
ان کے خالص اسلامی شعور کا نتیجہ ہے ۔ انھوں نے اپنے کلام میں اسلامی
تعلیمات ، اسلامی تاریخ اور مسلمانوں کے مسائل ہی کو موضوع گفتگو بنایا ہے
ان کا کوئی سا مجموعہ کلام ہاتھ میں اٹھا لیں اور کہیں سے بھی ورق الٹ
کر پڑھنا شروع کردیں محسوس ہوگا کہ ایک دردمند مسلمان شاعر، اسلام کے
پیغام کو اپنے کلام کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے ۔ اقبال نے
اسلام اور مسلمانوں کی بات کس کس زاوئے سے اور کس کس انداز میں کی ہے
اس کا جائزہ باعث طوالت ہوگا ۔ ذیل میں ہم بانگ درا ہی سے کچھ اور
اشعار بطور نمونہ درج کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ اقبال کا اصل تصور
قومیت کیا ہے ۔

حصہ غزلیات کا ایک شعر ہے :

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اقبال کا یہی ایک شعر وطنی قومیت کی نفی کے لئے کافی ہے -

بانگ درا کی ایک نظم ''مذہب'' میں اور وضاحت سے وطنی اور ملکی قومیت کے غلط تصور کے آگے اسلامی قومیت کی اصل بنیاد کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

خضر راہ میں فرماتے ہیں :

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصار دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہگذر

اقبال نے یہ اشعار ان اشعار کے بعد کہے ہیں جن میں وطن قومیت کی بنیاد ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں انھوں نے خود ہی اپنے ابتدائی خیالات پر خط نسخ کھینچ دیا ۔ اس لئے جب ہم اقبال کا ذکر بحیثیت قومی شاعر کے کرتے ہیں تو ہماری مراد مسلمان قوم ہوتی ہے ۔

اقبال کا مقام ایک قومی شاعر کی حیثیت سے بہت بلند ہے ۔ وہ صحیح معنوں میں مسلمانوں کے قومی شاعر ہیں ۔ مگر ان کا یہ جذبہ قومیت تنگ نظری اور تعصب پر مبنی ہرگز نہیں ۔ وہ اسلام کے شیدائی ہیں اس لئے اسلامی تعلیم کے مطابق اسلامی قومیت کا گہرا شعور ان میں پایا جاتا ہے ۔ لیکن اسلام اور مسلمانوں سے محبت کا نتیجہ دوسروں سے نفرت نہیں ۔ انھیں دنیا کے تمام انسانوں سے محبت ہے :

شراب روح پرور ہے محبت نوع انسان کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

بحیثیت قومی شاعر اقبال کا تعارف نامکمل رہے گا اگر ہم ان کی ایک مختصر سی نظم ''شاعر'' کا ذکر نہ کریں ۔ اس نظم میں اقبال واضح کرتے ہیں کہ دیگر طبقات اور اداروں کے علاوہ خود شاعر کا تعلق قوم کے ساتھ کیا ہوتا ہے :

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم
منزل صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفل نظم حکومت چہرۂ زیبائے قوم
شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

—:—()—:—